بحث ونظر

صالح اہلِ کتاب کے اوصاف

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

گزشتہ قوموں میں سے یہود اور نصاریٰ کا تذکرہ قرآن میں تفصیل سے آیا ہے۔ اور ان میں بھی یہود کے حالات نسبتہً زیادہ تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے بے پایاں انعامات واحسانات کیے، انھیں دوسری قوموں پر فضیلت بخشی اور انھیں دنیا کی امامت سے سرفراز فرمایا۔ اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اللہ کا شکر بجالاتے اور اس نے اطاعت وفرماں برداری کا رویہ اختیار کرنے، اچھے کام کرنے اور برے کاموں سے باز رہنے کا جو عہد لیا تھا اس کی پابندی کرتے۔ مگر اس کے برخلاف انھوں نے قدم قدم پر عہد شکنی کی۔ اللہ تعالیٰ کی معصیت کے کام کیے اور طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا ہوئے اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی میں انھیں آگاہ کر دیا تھا کہ اگر انھوں نے شکر اور احسان مندی کا مظاہرہ کیا تو ان پر مزید انعامات واکرامات کی بارش ہوگی لیکن اگر کفر کی روش پر چلے تو عذاب سے دوچار ہوں گے (ابراہیم - ۷) پھر بعد میں بھی جب انھوں نے متعدد مواقع پر سرتابی کی، شرک میں مبتلا ہوئے، اللہ تعالیٰ سے بے جا مطالبے کیے اور پستی اور دوں ہمتی کا مظاہرہ کیا تو اس نے انھیں فوراً سزا دینے کے بجائے سنبھلنے کا موقع دیا کہ شاید ان میں شکر کا جذبہ بیدار ہوجائے اور وہ راہِ راست اختیار کریں (البقرہ: ۵۲، ۵۵، ۵۶، ۲۴۳) مگر انھوں نے ہر موقع پر ناشکری کی، کفر کیا اور غضب الٰہی کے مستحق ہوئے۔

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰھُمْ	بنی اسرائیل سے پوچھو: کیسی کھلی کھلی
مِّنْ اٰیَةٍ بَیِّنَةٍ، وَمَنْ یُّبَدِّلْ	نشانیاں ہم نے انھیں دکھائی ہیں (اور
نِعْمَةَ اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ	پھر یہ بھی انہی سے پوچھ لو کہ) اللہ کی نعمت
فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ	پانے کے بعد جو قوم اس کو شقاوت
(البقرہ - ۲۱۱)	سے بدلتی ہے اسے اللہ کیسی سخت

سزا دیتا ہے۔

احسان ناشناسی کے نتیجے میں انھیں حدود اللہ کو پامال کرنے، احکام الٰہی کی مخالفت کرنے اور نبوی تعلیمات و ہدایات کو پس پشت ڈالنے میں کوئی باک نہ رہا۔ انھوں نے غیر اللہ کی پرستش کی۔ انبیاء کو نہ صرف جھٹلایا بلکہ ان کے قتل کے درپے ہوئے۔ اللہ کی کتاب میں من مانی تاویل اور تحریف کی، بے جا غرور اور پندار میں مبتلا ہوئے طرح طرح کی اعتقادی اور اخلاقی برائیوں کا شکار ہوئے، باہم اختلاف و تفرقہ کو ہوا دی اور ایسی زندگی کا نمونہ پیش کیا جو سراسر اللہ کی معصیت، الٰہی تعلیمات سے اعراض اور خواہشات نفس کی اتباع پر مبنی تھی۔

اہل کتاب کے صالح عناصر

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اہل کتاب کے تمام افراد کا حال تھا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں صالح عناصر بھی خاصی تعداد میں تھے۔ ان کا اللہ پر پختہ ایمان تھا۔ وہ اس کے عہد و میثاق پر قائم تھے۔ اس کی کتاب کی تلاوت کرتے، اس کے احکام پر عمل کرتے اور اس کی عبادت بجا لاتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنے ان بھائی بندوں کی اصلاح کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے جو غلط کاریوں اور کج رویوں کا شکار تھے۔ وہ انھیں اچھے کاموں کا حکم دیتے اور برے کاموں سے روکتے تھے۔ قرآن کریم نے اہل کتاب کے سلسلہ میں جہاں ایک طرف ان کی اکثریت کی بدعہدی، بداعتقادیوں اور بداعمالیوں کا تذکرہ کیا ہے وہیں دوسری طرف ان کے صالح عناصر کی بھی نشان دہی کی ہے جو ان سے الگ تھلگ اور راست روی پر قائم تھے۔ وہ صاف صاف کہتا ہے کہ تمام اہل کتاب کا معاملہ یکساں نہیں ہے۔ اگر ان کی اکثریت فسق و فجور میں مبتلا ہے تو ان میں کچھ صالح لوگ بھی ہیں:

لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ	سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔
أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ	ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ راست
اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ	پر قائم ہیں۔ راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے
يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ	ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے
وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ	ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان

عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي
الْخَيْرَاتِ، وَاُولٰئِكَ مِنَ
الصَّالِحِيْنَ ٥ وَمَا يَفْعَلُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوْهُ، وَاللّٰهُ
عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ ۔ ٥
(آل عمران : ۱۱۳-۱۱۵)

رکھتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں
سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں
سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور جو
نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی
جائے گی۔ اللہ پرہیزگار لوگوں کو خوب
جانتا ہے۔

میثاق الٰہی کے تعلق سے جہاں وہ یہ بیان کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کی اکثریت اس پر پوری نہ اتری اور اس نے اس سے منہ موڑ کر خوب من مانی کی وہیں وہ یہ بھی صراحت کر دیتا ہے کہ کچھ لوگ، اگرچہ ان کی تعداد بہت مختصر تھی۔ اس میثاق پر سختی سے کاربند تھے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ
لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَ
بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي
الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ
وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا
وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا
الزَّكٰوةَ، ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا
مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۔ ٥
(البقرہ : ۸۳)

یاد کرو اسرائیل کی اولاد سے ہم نے
پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی
عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ،
رشتے داروں کے ساتھ، یتیموں اور
مسکینوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا،
لوگوں سے بھلی بات کہنا، نماز قائم کرنا
اور زکوٰۃ دینا، مگر تھوڑے آدمیوں کے
سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور
اب تک پھرے ہوئے ہو۔

صالح اہل کتاب کے اوصاف

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن نے اہل کتاب کا تذکرہ کرنے میں حق وانصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ اس نے جہاں ان کی اکثریت کی بدعہدی اور بداعمالی پر ان کی مذمت کی ہے وہیں ان کے صالح عناصر کے بارے میں تحسین وآفریں کے کلمات کا اظہار کیا ہے اور ان کی ہمت افزائی کی ہے۔

اس مقالہ میں یہ مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن نے صالح اہل کتاب

کے کن اچھے اوصاف کو نمایاں کیا ہے اور انھیں اہل ایمان کے لیے نمونہ بنا کر پیش کیا ہے:

۱۔ خشیتِ الٰہی

بنی اسرائیل مصر میں فرعونیوں کی غلامی سے نکل کر بیابانِ سینا میں آئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں فلسطین کی مقدس سرزمین پر غلبہ بخشنے کا وعدہ کیا اور انھیں حکم دیا کہ اس پر حملہ کر کے قابض ہو جائیں۔ اس زمانے میں اس سرزمین پر مشرک قومیں آباد تھیں جو طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھیں۔ ان کے ڈیل ڈول، طاقت اور زور آوری کو دیکھ کر بنی اسرائیل نے سخت بزدلی کا مظاہرہ کیا اور اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ سے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک یہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم ہرگز اس کا قصد نہ کریں گے۔ لیکن انہی لوگوں میں سے دو اشخاص ایسے تھے جن پر اللہ نے اپنا فضل و انعام فرمایا تھا اور ان کے دلوں میں اللہ کا خوف تھا ــــ اور جس کے دل میں اللہ کا خوف ہو وہ ماسوا سے خوف اور بزدلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا ــــ انھوں نے پوری شجاعت اور جواں مردی کے ساتھ اپنی قوم کو للکارا اور اللہ پر بھروسہ کر کے یلغار کر دینے کو کہا۔ لیکن ان کی پکار نقارخانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی اور پوری قوم ٹس سے مس نہ ہوئی۔ قرآن نے جہاں پوری قوم کی بزدلی، دوں ہمتی اور بے طاقتی کا نقشہ کھینچا ہے وہیں ان دونوں اشخاص کے صبر و استقلال، عزیمت، جرأت مندی اور بے خوفی کو بھی سراہا ہے:

قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ[1] اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (المائدہ: ۲۳)

اس پر دو آدمیوں نے کہ اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے اور خدا نے انھیں (ایمان کی) نعمت عطا فرمائی تھی، لوگوں سے کہا (اس قدر بے طاقت اور بزدل کیوں ہو رہے ہو؟) ہمت کر کے ان لوگوں پر جا پڑو اور (شہر کے) دروازے میں جا داخل ہو۔ اگر تم (ایک مرتبہ) داخل ہو گئے تو پھر غلبہ تمہارے ہی لیے ہے۔ اگر تم ایمان رکھنے والے ہو تو چاہیے کہ اللہ پر بھروسہ کرو۔ (ترجمہ ابوالکلام آزاد)

---

[1] 'الذین یخافون' کے دو مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ "جو لوگ جباروں سے ڈر رہے تھے" اور دوسرے یہ کہ "جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے تھے" معاصر مفسرین میں مولانا امین احسن اصلاحی نے اوّل الذکر مفہوم اختیار کیا ہے۔ =

بائبل میں ہے کہ یہ دونوں اشخاص یشوع بن نون اور کالب بن یفنہ تھے۔ انھوں نے اللہ کے عہد کو یاد دلاتے ہوئے اپنی قوم کو سمجھایا کہ اس قدر بزدلی کا مظاہرہ نہ کریں:

"اگر خداہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا اور وہی ملک جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے، ہم کو دے گا۔ فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو۔ وہ تو ہماری خوراک ہیں۔ ان کی پناہ ان کے سر پر سے جاتی رہی ہے اور ہمارے ساتھ خداوند ہے۔ سو ان کا خوف نہ کرو۔"[1]

مگر ان کی باتوں پر کسی نے کان نہ دھرا اور جنگ پر بالکل آمادہ نہ ہوئے۔ اس بزدلی کی سزا اللہ تعالیٰ نے چالیس سالہ صحرانوردی کی شکل میں دی۔ بالآخر جب وہ تمام لوگ مرکھپ گئے جو جوانی کی عمر میں مصر سے نکلے تھے اور نئی نسل جوان ہوگئی اور اس دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا بھی انتقال ہوگیا تو انہی حضرت یوشع کی زیر قیادت بنی اسرائیل دشمنوں سے جنگ کرکے فلسطین کو فتح کرسکے۔

۲۔ استحضارِ آخرت

شجاعت و جواں مردی کا دوسرا سرچشمہ استحضارِ آخرت ہے۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے نزدیک یہ دنیاوی زندگی ہی سب کچھ ہے۔ جو یہاں مرگیا اس کا قصہ تمام ہوا۔ یہ تصور انسان میں بزدلی اور پست ہمتی پیدا کرتا ہے۔ اس کے برخلاف جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ دنیاوی زندگی محض چند روزہ اور فانی ہے حقیقی زندگی — جو ابدی ہوگی — اس کا آغاز اس وقت سے ہوگا جب یہ زندگی ختم ہوجائے گی اور یہ کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کردیتے ہیں وہ مرتے نہیں بلکہ اپنے رب کے پاس زندہ رہتے اور اس کی ملاقات سے شرف یاب ہوتے ہیں۔ یہ عقیدہ موت کو ان کی نظر میں زندگی سے زیادہ عزیز اور پسندیدہ بنا دیتا ہے اور وہ دشمن کی قلت و کثرت کی

= مولانا مودودی کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے جب کہ مولانا فراہی، شیخ الہند محمود حسن، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور سید قطب وغیرہ نے دوسرا مفہوم اختیار کیا ہے۔ قدیم مفسرین نے اس کے ایک سے زائد معانی بیان کیے ہیں۔ البتہ ان میں سے بیشتر کا رجحان موخرالذکر مفہوم کی طرف ہے۔ دیکھئے طبری، ابن کثیر، رازی اور زمخشری وغیرہ۔

[1] کتاب گنتی باب ۱۴ ۸ — ۹۔

پرواہ کیے بغیر دادِ شجاعت دیتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کی صورت حال کا مظاہرہ جالوت کی فوج کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کی طرف سے ہوا۔ انھوں نے اپنے وقت کے نبی سے ازخود جہاد کرنے کی خواہش ظاہر کی اور اس کے لیے ایک بادشاہ مقرر کرنے کا مطالبہ کیا۔ مگر جب اس کا تقرر ہوگیا تو اس کی اطاعت و فرماں برداری، عسکری نظم اور ڈسپلن کا ادنیٰ سا بھی مظاہرہ انھوں نے نہ کیا۔ بلکہ جالوت کی بڑی فوج دیکھ کر ان کے ہاتھ پیر پھول گئے اور وہ لڑنے کی ہمت کھو بیٹھے۔ لیکن ان کے درمیان کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو حقیقی ایمان سے بہرہ ور تھے اور جنھیں اپنے رب کی ملاقات کا یقین تھا۔ انھوں نے ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا اور بزدلی دکھانے والے اپنے ساتھیوں کو بھی ابھارا کہ دشمن کی کثرتِ تعداد دیکھ کر ہمت نہ ہارو اس لیے کہ فتح تعداد سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے ہوتی ہے:

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ۔

(البقرہ - ۲۴۹)

پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی مسلمان دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انھوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے انھوں نے کہا "بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آگیا ہے۔ اللہ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔

اس آیت میں دو کردار پیش کیے گئے ہیں۔ ایک کردار تو طالوت کی فوج کی اکثریت کا ہے جو اطاعت امیر اور ڈسپلن میں کوتاہ اور بزدل تھی۔ وہ جالوت کے لشکر جرار کو دیکھتے ہی ہمت ہار بیٹھے اور کہہ اٹھے کہ ہم میں اس سے جنگ کرنے کی سکت نہیں اور دوسرا کردار ان لوگوں کا ہے جن کی تعداد اگرچہ کم تھی مگر ان کے دل خشیت الٰہی اور جذبۂ جہاد سے معمور تھے انھوں نے نہ صرف ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا بلکہ اپنے ساتھیوں

میں بھی جرأت و ہمت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کی پامردی اور ثابت قدمی کا سبب یہ تھا کہ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا عقیدہ جاگزیں تھا۔ آیت میں 'ظن' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی گمان کے بھی آتے ہیں اور یقین کے بھی۔ یہاں اس کا استعمال یقین کے معنی میں ہوا ہے[1]۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ جب جالوت کی فوج کے مقابلہ پر آئے تو اپنی طاقت پر بھروسہ کرنے کے بجائے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے صبر و استقامت اور نصرت کی دعا کی:

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا	اے ہمارے رب، ہم پر صبر کا فیضان
وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى	کر، ہمارے قدم جمادے اور اس کافر
الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (البقرہ - ۲۵۰)	گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔

بالآخر اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے وہ فتح سے ہم کنار ہوئے اور دشمن کو شکست ہوئی۔

قرآن نے اہل کتاب میں سے 'راسخین فی العلم' کے جو اوصاف بیان کیے ہیں ان میں سے ایک ان کا ایمان بالآخرت بھی ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	اللہ اور روز آخر پر سچا عقیدہ
الْاٰخِرِ (النساء - ۱۶۲)	رکھنے والے۔

۳۔ احکام الٰہی پر عمل

اہل کتاب کی سرگزشت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قدم قدم پر احکام الٰہی سے سرتابی کرنے والے، اللہ کے رسول کی اطاعت سے منہ موڑنے والے اور اپنی خواہشات کے پیچھے دوڑنے والے تھے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر انھوں نے توریت اور انجیل کے احکامات کو نافذ کیا ہوتا اور اپنے رب کی ہدایات اور تعلیمات پر عمل کرتے ہوتے تو وہ اخروی انعامات کے علاوہ اس دنیا میں بھی الٰہی نعمتوں سے بہرہ ور ہوتے مگر انھوں نے

---

[1] ظن کی لغوی تشریح اور کلام عرب سے استشہاد کے لیے دیکھئے تدبر قرآن۔ مولانا امین احسن اصلاحی۔ مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، طبع سوم ۱۹۷۶ء جلد اول ص: ۱۴۹ سورہ البقرہ آیت ۴۶ کی تشریح۔

تو بدعلی کو اپنا پیشوا بنا لیا تھا۔ توریت میں بنی اسرائیل کو جو قوانین دئے گئے تھے ان میں بھی اسی کی صراحت ہے (دیکھئے احبار باب ۲۶، استثناء باب ۲۸) لیکن ان میں اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی تھے جو اس کی رضا کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب بھی ان تک اس کا کوئی حکم پہنچتا وہ بے چوں وچرا اس کی تعمیل کرتے تھے۔ قرآن نے ایسے لوگوں کو 'امت مقتصدہ' (راست رو جماعت) کے لقب سے نوازا ہے، کہتا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ	کاش انھوں نے توراۃ اور انجیل اور
وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ	ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو
مِنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ	ان کے رب کی طرف سے ان کے
فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ	پاس بھیجی گئی تھیں۔ ایسا کرتے تو ان
مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ	کے لیے اوپر سے رزق برستا اور نیچے
وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ	سے ابلتا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ
(المائدہ - ۶۶)	راست رو بھی ہیں لیکن ان کی اکثریت
	سخت بدعمل ہے۔

'اقتصاد' عربی زبان میں سلامت روی کو کہتے ہیں۔ اسی طرح اس کا استعمال دو انتہاؤں کے درمیان رہنے کے لیے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً سخاوت کریہ اسراف اور بخل کے درمیان ایک حالت ہے[1]۔ اہل کتاب میں سے یہود کا معاملہ یہ تھا کہ وہ بہت سی بدعملیوں کا شکار ہو گئے تھے۔ انھوں نے دین کے تقاضوں پر عمل ترک کر دیا تھا اور احکام دین کو بجا لانے میں سخت کوتاہ ہو گئے تھے۔ اس کے برخلاف نصاریٰ دین میں غلو کرنے لگے تھے اور انھوں نے بعض ایسی چیزیں اپنے اوپر لازم کر لی تھیں جن کا انھیں حکم نہیں دیا گیا تھا۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ان میں ایک جماعت ایسی تھی جو افراط اور تفریط سے بچتے ہوئے درمیانی راہ پر گامزن تھی۔ مفسر طبری نے اس کی تشریح میں حضرت ربیع بن انس کا یہ قول نقل کیا ہے۔

لا هم جفوا فی الدین	نہ انھوں نے دین میں کوئی کوتاہی کی

---

[1] المفردات فی غریب القرآن۔ راغب اصفہانی۔ المطبعۃ المیمنیہ، مصر ص: ۴۱۴ مادہ قصد۔

ولاھم غلو اسلہ — اور نہ غلو سے کام لیا۔

مشہور تابعی حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ یہ ان اہل کتاب کا تذکرہ ہے جو بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔[۴۲]

حضرت موسیٰ کے مابعد عہد میں عمالقہ کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر بنی اسرائیل نے اس وقت کے نبی سے گزارش کی کہ ان پر ایک بادشاہ مقرر کردیں تاکہ وہ اس کی قیادت میں ان ظالموں سے جہاد کرسکیں۔ لیکن جب اس مطالبہ کی تکمیل کردی گئی تو وہ جہاد سے جی چرانے لگے۔ البتہ اس وقت کچھ صالح سرشت اور پاک طینت لوگ ایسے تھے جنھوں نے اس حکم الٰہی کو بسروچشم قبول کیا اور اللہ کی راہ میں جنگ کرنے کا عزم ظاہر کیا۔

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ	مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا تو
تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ	ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب
وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ	بیٹھ موڑ گئے اور اللہ ان میں سے
(البقرہ - ۲۴۶)	ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔

قبولیتِ حق

صالح اہلِ کتاب کا ایک نمایاں وصف قرآن نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ بے جا عصبیت سے کوسوں دور تھے۔ اکثر بنی اسرائیل کی طرح کا نسلی اور قومی غرور ان میں نام کو نہ تھا۔ انھیں جہاں بھی حق کی روشنی نظر آتی وہ پروانوں کی طرح اس کی طرف لپکتے تھے انھیں جو بھی ایمان اور راست روی کی طرف بلاتا تھا اس کی آواز پر لبیک کہتے تھے۔ یہود کو آخری نبی کا شدت سے انتظار تھا اس لیے کہ اس کی بشارت ان کی مذہبی کتابوں میں موجود تھی۔ وہ اپنے دشمنوں کو دھمکیاں دیتے تھے کہ اب وہ وقت قریب آچکا ہے جب ہم "اس نبی" کے ساتھ مل کر تمہارے ایک ایک ظلم کا بدلہ لیں گے۔ مگر جب وہ نبی آگیا تو محض اس وجہ سے وہ اس پر ایمان نہ لائے کہ وہ ان کی نسل سے نہ تھا۔ بلکہ اس کی مخالفت میں انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن ان میں کچھ پاک طینت لوگ ایسے بھی

---

[۱] تفسیر جامع البیان۔ طبری (طبع دوم) دارالمعارف مصر تحقیق محمود محمد شاکر، احمد محمد شاکر جلد/۱۰ ص: ۶۹۲

[۲] تفسیر طبری حوالہ سابق۔

تھے جنھوں نے حق کو قبول کرنے اور آخری نبی پر ایمان لانے میں ذرا بھی تاخیر نہ کی۔ تورات کی بشارتوں کے مطابق انھوں نے آپؐ کو پہچان لیا اور فوراً مشرف با سلام ہو گئے۔ قرآن میں ہے:

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ، لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا (آل عمران - ۱۹۹)	اہل کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں۔ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی۔ اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔

اس آیت کی شانِ نزول میں کئی اقوال ہیں۔ ایک قول حضرت مجاہدؒ سے یہ مروی ہے کہ اس میں یہود و نصاریٰ دونوں میں سے ان لوگوں کا تذکرہ ہے جنھوں نے اللہ کے رسولؐ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے اسلام قبول کر لیا تھا[1]۔ امام طبری اور امام رازی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ رازی فرماتے ہیں: "سابقہ آیات میں بتایا گیا ہے کہ اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اس کے بعد اب اس آیت میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے وہ اجر و ثواب کے مستحق ہوں گے"[2]۔

قرآن نے نصاریٰ کے بھی اسی وصف کو نمایاں کیا ہے کہ جب وہ آخری نبی پر نازل ہونے والی آیات سنتے ہیں تو حق پہچان کر ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو نکل آتے ہیں اور وہ اس کی طرف دیوانہ وار لپکتے اور دائرہ ایمان میں داخل ہو جاتے ہیں:

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ	جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی

---

[1] تفسیر طبری ۷/۴۹۹، تفسیر کبیر فخر الدین رازی المطبعۃ العامرہ مصر ۱۳۰۸ھ ۳/۱۳۱، کشاف / الزمخشری مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ مصر ۱/۴۹۱ [2] تفسیر کبیر حوالہ سابق

تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ، يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا جَاءَنَا مِنَ الْحَقِّ، وَنَطْمَعُ أَن يُدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصَّالِحِينَ ۝

(المائدہ: ۸۳-۸۴)

کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں، وہ بول اٹھتے ہیں کہ "پروردگار ہم ایمان لائے، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ "آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لائیں اور جو حق ہمارے پاس آیا اسے کیوں نہ مان لیں جب کہ ہم اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے۔

روایتوں میں ہے کہ یہ آیات نجاشی اور ان کے ان درباریوں کے بارے میں نازل ہوئی تھیں جو مہاجرینِ حبشہ کی دعوت پر ایمان لے آئے تھے۔ لیکن امام طبری فرماتے ہیں کہ "ان کا اطلاق ان تمام متبعین عیسیٰ پر ہو سکتا ہے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا اور وہ آپ پر ایمان لے آئے۔ انھوں نے جب قرآن سنا تو حق کو پہچان لیا اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا"۔[1]

احادیث میں ایسے اہل کتاب کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے جنھوں نے اللہ کے آخری نبی کی دعوت پر لبیک کہا اور شرح صدر کے ساتھ آپ پر ایمان لے آئے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین آدمی دہرے اجر کے مستحق ہیں۔ ان میں سے ایک اہل کتاب میں سے وہ شخص ہے جو اپنے نبی پر ایمان کے ساتھ مجھ پر بھی ایمان لایا ہو"۔[2] ایسے لوگوں کو قرآن نے "راسخین فی العلم" (پختہ علم رکھنے والے) کے وصف سے متصف کیا ہے:

لٰكِنِ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ

مگر ان میں جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایمان دار ہیں وہ سب اس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو اے نبی تمہاری

---

[1] تفسیر طبری ۱۰/۵۰۱ - ۵۰۲

[2] صحیح بخاری، کتاب العلم صحیح مسلم، کتاب الایمان ۲۱۲

وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (النساء: ۱۶۲)

طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی۔

اور انھیں رحمت الٰہی کا مستحق قرار دیتے ہوئے ان کی فلاح کی ضمانت دی ہے۔

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ..... فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ أُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (الاعراف: ۱۵۶-۱۵۷)

میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے اور میری آیات پر ایمان لائیں گے۔ (پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی امی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے..... لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

۵۔ اعتصام بالکتاب

بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کا ایک احسان یہ تھا کہ اس نے ان کی ہدایت کے لیے کتاب نازل کی۔ مگر انھوں نے ناشکری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس میں تحریف کی۔ اس کی جو باتیں ان کے کام اور فائدے کی تھیں، انھیں باقی رکھا۔ اور جو احکامات ان کی خواہشات سے متصادم تھے، انھیں چھپا دیا، ان کی بے جا تاویلیں کیں یا انھیں کتاب سے نکال دیا۔ اور اپنی من چاہی باتیں کتاب الٰہی میں شامل کر دیں تاکہ اس کے ذریعہ چند روزہ زندگی کی لذتوں سے بہرہ ور ہونے کا جواز حاصل کر سکیں۔ لیکن ان کے درمیان جو نیک لوگ تھے ان کا رویہ اس سے مختلف تھا۔ ان کی طرف جو کتاب نازل کی گئی تھی اس کی وہ تلاوت

کرتے،اس پر ایمان رکھتے، اور اس کے احکامات اور ہدایات کی پابندی کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی توصیف کرتے ہوئے فرماتا ہے :

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ	جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے
یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ	وہ اسے اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ
(البقرہ: ۱۲۱)	پڑھنے کا حق ہے۔

اس آیت میں کن لوگوں کا تذکرہ ہے اس سلسلہ میں کئی اقوال ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد اہل ایمان ہیں۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد یہود میں سے وہ لوگ ہیں جو آخری رسول پر ایمان لائے، یہ قول حضرت قتادہؒ سے مروی ہے[1] امام رازی نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ "اس سے پہلے کی آیات میں اہل کتاب کی بداعمالیوں کا ذکر کرکے ان کی مذمت کی گئی ہے اس کے معاً بعد اس آیت میں ان میں سے ان لوگوں کا ذکر کیا گیا جنھوں نے توریت میں غور وفکر کیا۔ اس میں تحریف سے اجتناب کیا اور اس کے ذریعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت جان لی[2]

تلاوت کا حق ادا کرنے سے کیا مراد ہے؟ بعض صحابہ وتابعین نے اس کی وضاحت کی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں : "اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تلاوت کا حق ادا کرنے سے مراد یہ ہے کہ جو چیزیں اس میں حلال ہیں ان کو حلال سمجھا جائے اور جو حرام ہیں ان کو حرام قرار دیا جائے۔ اسے اسی طرح پڑھا جائے جیسے اللہ نے نازل کیا ہے۔ اس میں کوئی تحریف کی جائے نہ کسی آیت کی بے جا تاویل کی جائے"۔ حضرت ابن عباسؓ سے بھی ایسا ہی قول مروی ہے۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں : "اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے محکم پر عمل کیا جائے، متشابہ پر ایمان لایا جائے اور مشکل مقامات کو حل کرنے کے لیے کسی عالم کی طرف رجوع کیا جائے"۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں : "اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا پورا اتباع کیا جائے جن چیزوں کا اس میں حکم دیا گیا ہے ان پر عمل کیا جائے اور جن کاموں سے روکا گیا ہے ان سے اجتناب کیا جائے"[3] امام رازی نے اپنی تشریح میں مذکورہ تمام باتیں جمع کر دی ہیں۔ پھر لکھا ہے : "آیت کی مذکورہ

---

[1] تفسیر القرآن الکریم ابن کثیر المکتبۃ التجاریۃ الکبریٰ مصر ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۷ء جلد اول ص ۱۶۳

[2] تفسیر کبیر ۱/ ۴۸۷ [3] تفسیر ابن کثیر ۱/ ۱۶۳، تفسیر قرطبی ۲/ ۹۵

تمام توجیہیں ممکن ہیں۔ کیونکہ ان سب میں باہم اشتراک ہے۔ اس لیے کلام اللہ کے معانی کی وسعت کے لیے اس لفظ کو اس قدر مشترک پر محمول کرنا بہتر ہے۔[1]

سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کے ناخلف لوگوں کا، جو کتاب الٰہی کے وارث ہونے کے باوجود دنیاوی آسائشوں میں مگن ہو گئے اور انھوں نے ہمیشہ حق بات کہنے کے عہد کی پرواہ نہ کی، تذکرہ کرنے کے بعد ان میں سے نیک کردار لوگوں کا یوں ذکرِ خیر فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝ (الاعراف - ۱۷۰)	جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں اور جنھوں نے نماز قائم کر رکھی ہے یقیناً ایسے نیک کردار لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔

قرآنِ کریم جب نازل ہوا تو اس کی آواز اہلِ عرب کے لیے نامانوس تھی۔ وہ اس کے من جانب اللہ ہونے پر شک کرتے تھے۔ اس موقع پر اس کی حقانیت پر ایسے ہی صالح اہلِ کتاب کو گواہ بنا کر پیش کیا گیا جو اپنی آسمانی کتاب سے حقیقی وابستگی اور اس کی تعلیمات سے آگاہی رکھتے تھے۔

فَاِنْ كُنْتَ فِيْ شَكٍّ مِّمَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ فَسْـَٔـلِ الَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكَ ۔ (یونس - ۹۴)	اب اگر تجھے اس ہدایت کی طرف سے کچھ بھی شک ہو جو ہم نے تجھ پر نازل کی ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لے جو پہلے سے کتاب پڑھ رہے ہیں۔

آیت میں الکتاب سے مراد توریت اور انجیل ہیں اور "الذین یقرءون" سے مراد اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہیں۔ جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔[2] حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ یہاں اشارہ اہلِ کتاب میں سے ان اہلِ تقویٰ اور اہلِ ایمان کی طرف ہے جنھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا۔[3] یہاں بظاہر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تفسیر کبیر ۱/۴۸۷ - ۴۸۸ [2] تفسیر طبری ۱۵/ ۲۰۱

[3] تفسیر طبری حوالہ سابق۔

سے ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کو قرآن میں شک تھا بلکہ یہ قرآن کا یہ ایک مخصوص اسلوب ہے۔ اس میں حقیقی خطاب ان منکرین حق سے ہے جو قرآن کے بارے میں طرح طرح کے شکوک پیش کر رہے تھے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں اس بات میں شک ہے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے تو منصف مزاج علمائے اہل کتاب سے پوچھ لو۔ وہ ضرور اس کی تصدیق کریں گے کہ قرآن جن باتوں کی طرف دعوت دے رہا ہے وہ بعینہ وہی ہیں جو ان کی کتاب میں موجود ہیں۔

مشرکین مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں بھی شک کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر اللہ کو نبی ہی بھیجنا تھا تو کسی فرشتے کو کیوں نہیں بھیج دیا؟ اس نے کیوں ہم ہی جیسے ایک شخص کو اس منصب پر فائز کر دیا جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور گھومتا ٹہلتا ہے اور اس میں کوئی انفرادیت اور عظمت کی شان نظر نہیں آتی؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ انسانوں کی ہدایت کے لیے کسی انسان کا بھیجا جانا ہی قرین حکمت و مصلحت ہے۔ پہلے بھی جتنے انبیاء آئے سب انسان تھے۔ اس حقیقت پر بھی انہی اہل کتاب کو گواہ بنایا گیا:

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا	اور اے نبی تم سے پہلے بھی ہم نے
نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ	انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا
الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ	جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔ تم لوگ
(الانبیاء: ۷)	اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو

۶۔ عبادت گزاری

اہل کتاب میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو متقی و خدا ترس اور عبادت گزار تھے۔ قرآن میں ان کا باندازِ تحسین تذکرہ کیا گیا ہے۔ سورۂ آل عمران میں صالح اہل کتاب کے جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک یہ وصف بھی ہے:

خَاشِعِينَ لِلَّهِ (آل عمران - ۱۹۹) اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں

سورۂ نساء میں یہود میں سے "راسخین فی العلم" کے اوصاف پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا۔
(النساء-۱۶۲)

مگر ان میں جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایمان دار ہیں وہ سب اس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو اے نبی تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی۔ اس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کرنے والے اور اللہ اور روز آخر پر سچا عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور اجر عظیم عطا کریں گے۔

اس آیت کے ابتدائی حصے میں "الراسخون" اور "المومنون" کے الفاظ حالت رفع میں ہیں۔ لیکن 'المقیمین' باوجود ان پر عطف ہونے کے حالت نصبی میں ہے۔ مفسرین نے اس کی متعدد توجیہیں کی ہیں۔ لیکن ان میں سے دل کو لگتی ہوئی توجیہ یہ ہے کہ وہ قواعد عربیت کی رو سے منصوب علی المدح ہے۔ یعنی اگر کسی چیز پر بہت زور دینا اور اس کی اہمیت بیان کرنا مقصود ہوتا ہے تو اسے منصوب استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا اس آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ صالح اہل کتاب اقامت صلوٰۃ کا خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ زمخشری نے لکھا ہے:

والمقیمین نصب علی المدح لبیان فضل الصلوٰۃ [1]

المقیمین منصوب علی المدح ہے۔ اس کے ذریعہ ادائیگی نماز کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے۔

اس کی اہمیت کا اندازہ ہمیں اس وقت بخوبی ہو جاتا ہے جب یہود سے متعلق قرآن کا یہ بیان ہماری نظر سے گزرتا ہے کہ ان کی اکثریت نے نمازوں سے غفلت برتنی شروع کر دی تھی فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ (مریم-۵۹) مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کچھ ایسے نیک نفوس بھی تھے

---

[1] الکشاف ۱/۵۸۲

جو علم میں راسخ اور ایمان سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ اقامت صلوٰۃ اور ادائیگی زکوٰۃ کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ ان کے ان اوصاف کا قرآن کے دیگر مقامات پر بھی ذکر ہے مثلاً:

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ (الاعراف : ۱۷۰)	جو لوگ کتاب کی پابندی کرتے ہیں اور جنھوں نے نماز قائم کر رکھی ہے یقیناً ایسے نیک کردار لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کریں گے۔
وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ (الاعراف - ۱۵۶)	میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اسے میں ان لوگوں کے حق میں لکھوں گا جو نافرمانی سے پرہیز کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔

اسی طرح صالح نصاریٰ کے بارے میں یہ بیان کرتے ہوئے کہ وہ اہل ایمان سے محبت رکھتے ہیں اس کا سبب ان کے زہد اور عبادت گزاری کو قرار دیا گیا ہے:

وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا۔ (المائدہ - ۸۲)	اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں۔

قسیسین قسیس کی جمع ہے اور رہبان راہب کی۔ قسیس نصاریٰ میں سے عبادت گزار عالم کو کہتے ہیں اور راہب سے مراد وہ شخص ہے جو ویرانوں اور خلوتوں میں غلو کی حد تک عبادت میں مشغول رہتا ہے[1]

۷۔ دعوتی ذمہ داریاں

بنی اسرائیل میں جب آہستہ آہستہ اعتقادی، عملی اور اخلاقی خرابیاں پیدا ہونے لگیں

---

[1] المفردات فی غریب القرآن ص: ۳۰۳، ۴۱۲ مادہ 'رہب' اور 'قس'۔

اور انھوں نے کج روی شروع کر دی تو ان میں سے ایک طبقہ ان کی اصلاح کے لیے سرگرم ہوگیا۔ یہ ان کے علماء و فقہاء کا طبقہ تھا۔ یہ لوگ راہِ حق پر قائم تھے۔ انھیں اپنے بھائیوں کی گمراہی پر دکھ ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ انھیں ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کرتے، انھیں اچھی باتوں کا حکم دیتے۔ برے کاموں کے انجام سے ڈراتے اور انھیں راست روی کی تلقین کرتے۔ قرآن نے ان کے جو اوصاف بیان کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے:

وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران - ۱۱۴)	نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں۔

دوسری جگہ مذکور ہے:

وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ۔ (الاعراف - ۱۵۹)	موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو حق کے مطابق ہدایت کرتا اور حق ہی کے مطابق انصاف کرتا تھا۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے کس زمانے کا حال بیان ہوا ہے اس سلسلہ میں دو اقوال مروی ہیں۔ ایک یہ کہ ان سے مراد عہد نبوی کے وہ یہودی ہیں جو مشرف باسلام ہوئے اور دوسرا قول یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل افراتفری کا شکار اور شرک و بدعات اور خرافات میں مبتلا تھے اس زمانے میں ان میں سے کچھ صالح لوگ ایسے تھے جو حضرت موسیٰ کے لائے ہوئے دینِ حق پر قائم تھے۔ اس میں تحریف و تبدیلی اور دوسری برائیوں کے ارتکاب سے بچتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی اسی دینِ حق کی طرف دعوت دیتے تھے۔ اس آیت میں انہی لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے[1]

لیکن بنی اسرائیل کی اکثریت کے تعلق سے ان مصلحین و داعیان کی کوشش رائیگاں گئیں۔ انھوں نے ان کی نصیحت پر کان نہیں دھرا۔ ان کے توجہ دلانے پر وہ اپنی بداعمالیوں پر نادم کیا ہوتے انھیں ان کا سمجھانا بھی ناگوار گزرتا تھا۔ وہ انھیں دھمکیاں دیتے بلکہ بسا اوقات انھیں جان سے مار دینے سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے (آل عمران - ۲۱)

---

[1] تفسیر کبیر ۳/۳۱۳-۳۱۴، الکشاف ۲/۱۲۳، تفسیر قرطبی ۷/۳۰۲، مولانا مودودی نے اسی موخر الذکر قول کو ترجیح دی ہے۔ دیکھئے تفہیم القرآن دوم ص: ۸۶-۸۷۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مصلحین نے انھیں ان کے برے کاموں پر ٹوکنا ہی چھوڑ دیا۔ وہ ان کی اصلاح سے مایوس ہو گئے اور انھوں نے سمجھ لیا کہ بس اب ہلاکت ہی ان کا مقدر ہے۔ یہ انداز فکر اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ وہ انھیں سرزنش کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ نتائج سے بے پرواہ ہو کر انھیں اپنا کام مسلسل کرتے رہنا چاہیے:

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ	کیوں ان کے علماء اور مشائخ انھیں گناہ
عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ	پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے
السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا	نہیں روکتے؟ یقیناً بہت ہی برا کارنامہ
يَصْنَعُوْنَ۔ (مائدہ-۶۳)	زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں۔

لیکن یہ تمام ہی علماء و مصلحین کا حال نہ تھا۔ بلکہ ان میں ایک معتدبہ تعداد ایسی تھی جو ان کی اصلاح سے مایوس نہیں ہوئی تھی۔ یہ لوگ انھیں سمجھانے بجھانے اور برائیوں سے باز رکھنے کی پیہم کوشش کرتے رہتے تھے۔ قرآن میں ایک واقعہ مذکور ہے جس سے مذکورہ تینوں گروہوں کے احوال پر روشنی پڑتی ہے۔

شریعتِ یہود میں سبت (ہفتہ) کے دن کو مقدس قرار دیا گیا تھا۔ اس دن ہر قسم کے کام کاج ممنوع تھے۔ لیکن بنی اسرائیل نے کچھ دن گزر جانے کے بعد اس قانون کی بھی خلاف ورزی شروع کر دی تھی۔ ساحلِ سمندر پر واقع ایک بستی[1] کے لوگ اس دن بھی مچھلی کا شکار کیا کرتے تھے۔ اس بستی کے نیک لوگوں نے انھیں اس حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ اس وقت ان مصلحین میں دو گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ انھیں وعظ و نصیحت کرنا فضول ہے؛ کیونکہ اب ان کے راست روی اختیار کرنے اور سرکشی سے باز آنے کی کوئی امید نہیں۔ جبکہ دوسرا گروہ کہتا تھا کہ ہمیں ان کی اصلاح کے سلسلہ میں برابر سرگرم رہنا چاہیے۔

---

[1] بیشتر مفسرین کا خیال ہے کہ بحر قلزم کے ساحل پر واقع اس بستی کا نام ایلہ تھا۔ تفسیر طبری ۱۳/۱۸۰-۱۸۱، تفسیر ابن کثیر ۲/۲۵۷ وغیرہ۔ اس کی جائے وقوع بحر قلزم کی اس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے جو جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اس کی جگہ آج عقبہ کا مشہور بندرگاہ واقع ہے۔ تفہیم القرآن سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ دوم ص۸۹

ہوسکتا ہے کبھی نہ کبھی ہماری بات ان کے دل میں بیٹھ جائے اور وہ راہِ راست پر آجائیں اور اگر ہمارے سمجھانے بجھانے کا، ان پر کوئی اثر ظاہر نہ بھی ہو تو کم از کم ہم اپنا فرض ادا کر کے تو عنداللہ بری ہو جائیں گے۔ قرآن نے ان گروہوں اور ان کے انجام پر یوں روشنی ڈالی ہے:

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۔

(الاعراف: ۱۶۵)

اور انھیں یہ بھی یاد دلاؤ کہ جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے گروہ سے کہا تھا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جنھیں اللہ ہلاک کرنے والا یا سخت سزا دینے والا ہے تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ "ہم یہ سب کچھ تمہارے رب کے حضور اپنی معذرت پیش کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس امید پر کرتے ہیں کہ شاید یہ لوگ اس کی نافرمانی سے پرہیز کرنے لگیں" آخر کار جب وہ ان ہدایات کو بالکل ہی فراموش کر گئے جو انھیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ (مولانا مودودیؒ)

اس آیت میں صراحۃً صرف دو گروہوں کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ ایک وہ لوگ جو آخر تک نافرمانوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے کوشاں رہے کہ ان کو عذاب سے بچا لیا گیا اور دوسرے وہ جو حکم الٰہی کی نافرمانی سے باز نہ آئے کہ انھیں دردناک عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے ان کی ہدایت یابی سے مایوس ہو کر وعظ و ارشاد کا کام بند کر دیا تھا۔ ان کے انجام سے قرآن خاموش ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وہ بھی مبتلائے عذاب ہوئے۔ جبکہ بعض کا خیال ہے کہ وہ نجات پانے

والوں میں سے تھے حضرت ابن عباسؓ پہلے اول الذکر رائے کے قائل تھے۔ مگر بعد میں انھیں دوسری رائے پر شرح صدر ہوگیا۔ حضرت عکرمہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مصحف ان کی گود میں تھا اور وہ زار و قطار روئے چلے جارہے تھے۔ میں ڈرتے ہوئے ان سے قریب ہوا اور رونے کا سبب دریافت کیا۔ انھوں نے سورۂ اعراف کی ان آیات میں مذکور واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا پھر فرمایا کہ اس میں ایک گروہ کے نجات پانے اور دوسرے کے ہلاک ہونے کا تذکرہ ہے۔ تیسرا گروہ جو برائیوں پر نہیں ٹوکتا تھا اس کا انجام مذکور نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مبتلائے عذاب ہوا۔ ہم بھی بہت سی ناپسندیدہ چیزیں دیکھتے ہیں مگر ان پر زبان نہیں کھولتے۔ کہیں ہم پر بھی ایسا ہی عذاب نہ آجائے؟! حضرت عکرمہ فرماتے ہیں: میں نے جواب دیا کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان نافرمانوں کی حرکتوں کو ناپسند کرتے اور ان کی مخالفت کرتے تھے البتہ آخر میں ان کی اصلاح سے مایوس ہوگئے تھے۔ اس لیے ان کا شمار بھی نجات پانے والوں میں ہونا چاہیے میرے اس جواب سے وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے انعام میں ایک جوڑا عنایت فرمایا۔[1]

۸۔ شریعتِ الٰہی کے مطابق فیصلہ

اہلِ کتاب جن برائیوں میں مبتلا ہوگئے تھے ان کا، ان کے علماء و فقہاء کی بڑی تعداد بھی شکار تھی۔ عوام کو تو کتابِ الٰہی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ رہے علماء تو اس کے تئیں ان کا تعلق بھی مطلوبہ طریقے پر نہ تھا۔ انھوں نے اس کی بہت سی تعلیمات کو فراموش کردیا تھا۔ خواہشاتِ نفس کی تکمیل اور دنیا کی چند روزہ آسائشوں کے حصول کی خاطر وہ کتابِ الٰہی کی تحریف سے بھی باز نہ رہے۔ لیکن ان میں کچھ ایسے متقی اور خدا ترس علماء اور فقہاء بھی تھے۔ جو عہدِ الٰہی پر قائم تھے۔ وہ توریت کی تعلیمات پر خود بھی عمل کرتے اور دوسروں کو بھی اسی کا حکم دیتے تھے۔ وہ نورِ ہدایت سے خود بھی مستفید ہوتے اور دوسروں کو بھی

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۲/۲۵۸ تفسیر طبری ۱۳/۱۸۷-۱۹۰

فیض پہنچاتے۔ وہ اس کے قوانین و احکام کو خود اپنی زندگیوں میں بھی نافذ کرتے اور دوسرے لوگوں کے معاملات کا فیصلہ بھی انہی کے مطابق کرتے۔ یہ فریضہ انھوں نے اس لیے نبھایا کیونکہ انھیں کتاب اللہ کا حامل و محافظ اور اللہ کی مخلوق کے سامنے اس کا گواہ بنایا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ (المائدہ - ۴۴)	ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی جو مسلم تھے اسی کے مطابق ان یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح ربّانی اور احبار بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انھیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے۔

'ربانیون' سے مراد وہ فقہا ہیں جو لوگوں کے معاملات میں فیصلہ کرنے والے اور ان کے مصالح و امور کی نگرانی کرنے والے ہوتے ہیں اور 'احبار' سے مراد علما ہیں۔[1] امام طبری نے اس آیت کی ایک مخصوص شانِ نزول بیان کی ہے۔ پھر لکھا ہے کہ "ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کسی مخصوص واقعہ پر منطبق کرنا ضروری نہیں۔ اس میں یہود کا ہر فقیہ (ربانی) اور عالم (حبر) داخل ہے"۔[2] مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

> "یہ تورات کے سچے اور مخلص حاملین کی روش بیان ہوئی ہے کہ کس طرح اللہ کے فرمانبردار نبیوں اور مخلص علما و فقہا نے خود اس کی اطاعت کی اور اس کے قوانین و احکام کے مطابق وہ یہودیوں کے معاملات و مقدمات کے فیصلے کرتے رہے اور اپنے اندر برابر اس احساسِ ذمہ داری کو زندہ رکھا کہ وہ خدا کی طرف سے اس کے امین

---

[1] تفسیر طبری ۱۰/۳۴۲

ومحافظ اوراس کے گواہ بنائے گئے ہیں۔ اس وجہ سے نہ تو اس میں ان کے لیے کوئی خیانت جائز ہے اور نہ اس کے اظہار واعلان میں کوئی کوتاہی روا ہے۔ یہ اللہ کا عہد ومیثاق ہے جو بہرحال انھیں پورا کرنا ہے۔[1]

۹۔ اطاعتِ امیر

جب خواہشاتِ نفس انسان پر غلبہ پالیتی ہیں اور وہ اپنی لگام ان کو سونپ دیتا ہے تو اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ کس کام میں اللہ کی رضا شامل ہے اور کون سا کام اس کے غضب کا باعث ہے؟ صبر وعزیمت کس چیز کا تقاضا کرتی ہے اور کس چیز سے ان کی بے صبری اور جلد بازی عیاں ہوتی ہے۔ اس کی اسے مطلق فکر نہیں ہوتی۔ کچھ یہی حال بنی اسرائیل کی اکثریت کا ہوگیا تھا۔ البتہ ان میں کچھ لوگ ایسے ضرور موجود تھے جو اپنے ہر کام میں اللہ کی رضا کو پیش نظر رکھتے تھے۔

بنی اسرائیل نے اپنے دشمنوں کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر ان کے خلاف جنگ کرنے کا ارادہ کیا اور اس وقت کے نبی سے مطالبہ کیا کہ کسی کو بادشاہ مقرر کردیں۔ یہ مطالبہ اگرچہ کچھ زیادہ پسندیدہ نہ تھا۔ لیکن جب ایک بادشاہ کا تقرر کردیا گیا تو وہ اس میں کیڑے نکالنے لگے۔ بدقت تمام وہ اس کی سربراہی میں جنگ کرنے کے لیے آمادہ تو ہوگئے لیکن اپنی خواہشات کے برخلاف اس کی ہدایات پر عمل کرنا انھیں گوارہ نہ تھا۔ بادشاہ نے ان کے نظم اور ڈسپلن کا امتحان لینے کے لیے انھیں حکم دیا کہ آگے دریا سے گزرنے پر کوئی اس سے سیرابی حاصل نہ کرے۔ ہاں ایک آدھ چلو پانی پی لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر جب وہ وہاں پہنچے تو ان کی اکثریت نے اس سے خوب پانی پیا اور اپنے سالارِ لشکر کے حکم کی مطلق پرواہ نہ کی۔ صرف کامل الایمان اور صداقت شعار لوگوں کا ایک مختصر گروہ ایسا تھا جس نے اس حکم کی تعمیل کی اور اس آزمائش میں پورا اترا۔ سورۂ بقرہ میں اس واقعہ پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے:

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ	پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا تو اس نے
قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ	کہا: ایک دریا پر اللہ کی طرف سے
فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ	تمہاری آزمائش ہونے والی ہے جو

[1] تدبر قرآن دوم۔ ص ۲۹۹

مِنِّیْ ، وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ	اس کا پانی پئے گا وہ میرا ساتھی نہیں۔
فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۔ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ	میرا ساتھی صرف وہ ہے جو اس سے
غُرْفَةً بِیَدِهٖ ، فَشَرِبُوْا	پیاس نہ بجھائے ۔ ہاں ایک آدھ چلو
مِنْهُ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ	کوئی پی لے تو پی لے، مگر ایک گروہ
(البقرہ - ۲۴۹)	قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے
	سیراب ہوئے۔

یہی وہ گروہ تھا جس نے میدانِ جنگ میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا۔ اور اس وقت جب فوج کی اکثریت ہمت ہار بیٹھی تھی، دشمنوں کا مردانہ وار مقابلہ کرکے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے انھیں شکست دی۔

۱۰۔ امانت

بنی اسرائیل کے لیے سود حرام کیا گیا تھا اور مالی معاملات میں انھیں امانتداری کا حکم دیا گیا تھا مگر جب ان میں مال و دولت کی حرص پیدا ہوگئی تو انھوں نے اس کے جواز کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے تراش لیے۔ سود خوری، بدعہدی خیانت اور غصب ان کا شیوہ اور طرۂ امتیاز بن گیا اور انہی چیزوں پر ان کا سارا کاروبار زور و شور سے چلنے لگا۔ لیکن ان میں کچھ صالح لوگ ایسے بھی تھے جن کے یہاں دینی قدریں زندہ تھیں۔ وہ باہم معاملات میں ان کا پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ کوئی ان کے پاس بڑی سے بڑی رقم بطور امانت رکھوائے وہ بری نیت سے اس کو ہاتھ بھی نہ لگاتے تھے۔ قرآن جہاں اکثریت کی خیانت اور بے ایمانی پر شدید تنقید کرتا ہے۔ وہیں ساتھ ہی ان نیک کردار لوگوں کا تحسین تذکرہ کرتا ہے۔ بلکہ ان کا ذکر مقدم رکھتا ہے:

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ	اہل کتاب میں کوئی تو ایسا ہے کہ اگر
اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ یُّؤَدِّهٖ	تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا
اِلَیْكَ ، وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ	ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمہارا مال
تَاْمَنْهُ بِدِیْنَارٍ لَّا یُؤَدِّهٖ	تمہیں ادا کر دے گا۔ اور کسی کا حال یہ

اِلَیۡکَ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَیۡهِ قَآئِمًا۔ (آل عمران - ۷۵)[1]

ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملہ میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا اِلّا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔

اس آیت کی تفسیر میں سید قطب شہید نے لکھا ہے:

"اہلِ کتاب کا حال بیان کرتے ہوئے قرآن حق و انصاف کی راہ اختیار کرتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی اور حق تلفی نہیں کرتا حالانکہ یہ لوگ اس وقت امتِ مسلمہ سے برسرِ پیکار تھے۔ اور تمام ادوار میں اہلِ کتاب کا یہی حال رہا ہے۔ لیکن اہلِ کتاب کی اسلام اور مسلمانوں کے لیے اس دشمنی، اسلام کے خلاف ان کے مکر و کید اور کینہ اور ناپاک سازشوں اور امتِ مسلمہ اور اس دین کے ساتھ ان کے ارادۂ شر کے باوجود قرآن ان کے نیکوکار افراد کے بارے میں ناانصافی نہیں کرتا۔ بحث و جدال اور مقابلہ کے موقع پر بھی نہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ اہلِ کتاب میں کچھ ایمان دار اور امانت دار لوگ بھی ہیں جو لوگوں کے حقوق اور ان کے مال، خواہ وہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ ہڑپ نہیں کرتے"[2]

۱۱۔ تواضع اور عدمِ تکبر

قرآن نے صالح نصاریٰ کا ایک وصف یہ نمایاں کیا ہے کہ وہ تکبر نہیں کرتے اور اسی بنا پر وہ اہلِ ایمان سے محبت رکھتے ہیں۔ جبکہ یہود اور مشرکین اہلِ ایمان سے عداوت کا مظاہرہ کرتے ہیں:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا الۡيَهُوۡدَ وَالَّذِيۡنَ اَشۡرَكُوۡا وَلَتَجِدَنَّ اَقۡرَبَهُمۡ

تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی

---

[1] مزید دیکھئے المائدہ - ۱۳۔

[2] فی ظلال القرآن: سید قطب شہید اردو ترجمہ سید حامد علی ہندوستان پبلیکیشنز دہلی دوم ص: ۱۹۲، ۴۲۶

مَوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ	میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنھوں
قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّ	نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ
مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا	سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور
وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۔	تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور
(المائدہ: ۸۲)	ان میں غرورِ نفس نہیں ہے۔

اس آیت میں یہود کو اہلِ ایمان کی عداوت میں شدید تر اور نصاریٰ کو ان کی دوستی میں قریب تر بتایا گیا ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟ امام رازی نے اس کی ایک لطیف توجیہ کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"نصاریٰ کا کفر یہود سے زیادہ شدید ہے۔ اس لیے کہ وہ توحید باری اور نبوت دونوں کے سلسلہ میں راہِ راست سے ہٹے ہوئے ہیں جبکہ یہود صرف نبوت کے معاملہ میں اہلِ ایمان سے اختلاف کرتے ہیں لیکن چونکہ اس کے باوجود نصاریٰ میں طلب دنیا کی زیادہ حرص نہیں پائی جاتی اور ان کے دل آخرت کی یاد سے غافل نہیں ہوتے۔ اس لیے انھیں اہلِ ایمان سے محبت کرنے والا قرار دیا گیا۔ اس کے برخلاف یہود کا کفر اگرچہ نصاریٰ سے کم درجے کا ہے لیکن انھیں بارگاہِ الٰہی سے دھتکار دیا گیا اور ان پر لعنت بھیجی گئی۔ اس کا سبب محض یہ ہے کہ ان میں دنیا کی شدید حرص پائی جاتی ہے۔ اس سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی صداقت آشکارا ہوئی ہے کہ "دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے"[1]

۱۲۔ رحم وکرم

اسی طرح قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین کا ایک امتیازی وصف یہ بیان کرتا ہے کہ ان کے دل رحمت ورأفت سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ اللہ کے بندوں کے

---

[1] تفسیر کبیر ۴۵۱/۳

ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں، ان کی پریشانیوں اور تکلیفوں میں سہارا بنتے ہیں اور ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ ان کی خدمت کرتے ہیں۔

وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ	اور ان سب کے بعد عیسیٰ بن مریم کو مبعوث
اٰتَيْنَاهُ الْاِنْجِيلَ، وَجَعَلْنَا	کیا اور اس کو انجیل عطا کی، اور جن لوگوں
فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ	نے اس کی پیروی اختیار کی ان کے
رَأْفَةً وَّرَحْمَةً (الحدید-۲۷)	دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔

آج عیسائی مشنریوں میں سماجی خدمات اور انسانوں کی فلاح و بہبود کا جو سرگرم جذبہ پایا جاتا ہے ہوسکتا ہے وہ اسی فیضانِ الٰہی کا پرتو ہو۔

صالح اہلِ کتاب کے تذکرہ کی حکمت

گزشتہ صفحات میں صالح اہلِ کتاب کے چند امتیازی اور نمایاں اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اپنی فطرت سلیم پر قائم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے جو عہد و میثاق لیا تھا اس پر عمل پیرا تھے۔ حق کو اختیار کرنے والے اور اس کی گواہی دینے والے تھے۔ یہ صالح عنصر یہود اور نصاریٰ دونوں میں ہر دور میں رہا ہے اگرچہ اس کی تعداد کم تھی۔ ان میں سے جو لوگ عہد نبوی میں زندہ تھے انھوں نے حق کو پہچان لیا اور بغیر کسی مذہبی تعصب کا مظاہرہ کیے اسے قبول کرنے کی طرف سبقت کی۔

قرآن میں اہلِ کتاب کے مفصل تذکرہ اور ان کی اکثریت کی بدعہدی اور اعتقادی، عملی اور اخلاقی برائیوں کے تذکرہ کے ساتھ ان میں سے صالح افراد کے ذکر خیر سے دو باتیں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں:

اول یہ کہ اہلِ کتاب کی تاریخ پر روشنی ڈالنے اور ان کے احوال بیان کرنے میں قرآن نے حق و انصاف سے پہلوتہی نہیں برتی ہے۔ اس نے اگر ایک طرف ان کی اکثریت کے اخلاقی تنزل، اعتقادی خرابیوں اور بداعمالیوں کا تذکرہ کیا ہے تو دوسری جانب ان میں سے صالح افراد کی تحسین کی ہے، ان کی خوبیوں کا فراخ دلی سے تذکرہ کیا ہے اور ان کے اچھے اوصاف بیان کیے ہیں۔

دوم یہ کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اصل اعتبار صرف ایمان اور نیک اعمال کا ہے

اگر کوئی ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہے اور اس کے اعمال بھی اچھے ہیں تو وہ آخرت میں اپنے رب کی طرف سے اس کی جزا پائے گا اور وہاں اس کی عطا کردہ نعمتوں سے شادکام ہوگا۔ لیکن اگر کسی سے برے اعمال سرزد ہو رہے ہیں اور اس کا ایمان بھی مشکوک ہے تو وہ خواہ اللہ تعالیٰ سے کتنے ہی تقرب کا اظہار کرے مگر بارگاہِ الٰہی میں اس کی کوئی قدر نہ ہوگی اور وہ وہاں اپنے برے اعمال کی سزا سے نہ بچ سکے گا۔ ارشاد باری ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ	یقین جانو کہ نبی عربی کو ماننے والے
هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ	ہوں یا یہودی عیسائی ہوں یا صابی
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ	جو بھی اللہ اور روز آخر پر ایمان لائے گا
وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ	اور نیک اعمال کرے گا اس کا اجر اس
عِنْدَ رَبِّهِمْ، وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ	کے رب کے پاس ہے اور اس کے
وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرہ-۶۲)	لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے

یہود اور نصاریٰ دونوں اس بات کے مدعی تھے کہ جنت ان کا مقدر ہے۔ اس لیے کہ وہ اللہ کے چہیتے ہیں اور دنیا کی قوموں پر انھیں فضیلت حاصل ہے۔ اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اجر اور اس کے انعامات کے مستحق تو صرف وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اس کے سامنے خود سپردگی اختیار کی ہوگی۔ اس کے حکموں پر چلے ہوں گے اور اس کی معصیت سے بچے ہوں گے:

وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ	ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جنت میں
اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی	نہ جائے گا جب تک کہ وہ یہودی نہ ہو
تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ قُلْ هَاتُوْا	یا (عیسائیوں کے خیال کے مطابق)
بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ	عیسائی نہ ہو۔ یہ ان کی تمنائیں ہیں ان
بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ	سے کہو اپنی دلیل پیش کرو۔ اگر تم اپنے
وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ	دعوی میں سچے ہو (دراصل نہ تمہاری
عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ	کچھ خصوصیت ہے نہ کسی اور کی) حق یہ
عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔	ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت
(البقرہ-۱۱۱-۱۱۲)	میں سونپ دے اور عملاً نیک روش

پر چلے اس کے لیے اس کے رب کے
پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے
لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔

اس طرح قرآن ہمارے سامنے دو نمونے پیش کرتا ہے۔ ایک ان لوگوں کا نمونہ جنھوں نے بدعہدی کی، کفر اور شرک میں مبتلا ہوئے، ہر قسم کی برائیوں کا ارتکاب کیا حق کو حق جان لینے کے باوجود مذہبی تعصب کی بنا پر اسے قبول کرنے سے اعراض کیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب اور لعنت کا نشانہ بنے اور دوسرا ان لوگوں کا نمونہ جو میثاق الٰہی پر قائم رہے۔ ایمان کے تقاضوں پر عمل پیرا رہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل اور منہیات سے اجتناب کرتے رہے اور جب ان کے سامنے حق آگیا تو دیوانہ وار اس کی طرف بڑھے اور اس کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام کے مستحق ہوئے۔ اب ہمیں اختیار ہے کہ اپنے لیے ان میں سے کون سا نمونہ اختیار کرتے اور اس کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک اہم اعلان

کاغذ، کتابت و طباعت کے اخراجات میں غیر معمولی اضافہ کے سبب تحقیقات اسلامی کی موجودہ قیمت برقرار رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس لیے اعلان کیا جاتا ہے کہ ۱۹۹۶ء کے پہلے شمارہ سے شرح خریداری حسب ذیل ہوگی۔

قیمت فی شمارہ		۲۰ روپیے
سالانہ زراعانت	(انفرادی)	۷۵ روپیے
"	(ادارے اور لائبریریاں)	۱۰۰ روپیے
بیرون ملک	(انفرادی)	۳۵۰ روپیے
"	(ادارے)	۵۰۰ روپیے
پاکستان	(انفرادی)	۱۵۰ روپیے
"	(ادارے)	۲۰۰ روپیے

امید ہے قارئین اور ایجنٹ صاحبان حسب سابق ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے۔ (مینجر)
ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، پان والی کوٹھی، دودھ پور علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

ادارہ تحقیق وتصنیف کی گرانقدر مطبوعات

تصنیف	مصنف	صفحات	قیمت
معرکۂ اسلام وجاہلیت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۲۱۶	۲۵/=
صحت ومرض اور اسلامی تعلیمات	مولانا سید جلال الدین عمری	۳۸۸	۷۰/=
اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور	"	۱۷۶	۳۵/=
مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ	"	۲۰۰	۳۵/=
اسلام اور مشکلاتِ حیات	"	۸۸	۸/=
مذہب کا اسلامی تصور	مولانا سلطان احمد اصلاحی	۵۹۱	۱۰۰/=
مشترکہ خاندانی نظام اور اسلام	"	۱۰۲	۲۰/=
وحدت ادیان کا نظریہ اور اسلام	"	۱۹۲	۴۰/=
عہد نبوی کا نظام حکومت	پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی	۱۳۶	۳۰/=
ایمان وعمل کا قرآنی تصور	الطاف احمد اعظمی علیگ	۲۸۰	۲۵/=
تصوف ـ ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر عبید اللہ فراہی	۲۰۰	۲۵/=
عہد نبوی کے غزوات وسرایا	ڈاکٹر رؤف اقبال	۲۴۷	۲۵/=

ادارۂ تحقیق نے اپنی اردو اور انگریزی مطبوعات کے علاوہ دیگر اہم مکتبوں کی علمی ودینی کتبے کی فراہمی کا بھی انتظام کیا ہے۔ فہرست کتب ایک خط لکھ کر طلب کی جاسکتی ہے

مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ